اھلا وسھلا ومرحبا بکم

دارالعلوم کا پیغام فضلاء کے نام

پچاس سالہ تقریب سعید

مؤرخہ ۱۲/شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ مطابق ۳۱/مئی ۲۰۱۵ء



* پیش کردہ *

حضرت مولانا اقبال صاحب ٹنکاروی دامت برکاتہم
مہتمم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا بھروچ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین، و الصلاۃ و السلام علی سید الانبیاء و المرسلین، وعلی آلہ و صحبہ اجمعین۔ اما بعد!

محترم فضلائے جامعہ! شکر وسپاس کے جذبات سے آج ہماری جبین نیاز بارگاہ ایزدی میں خم ہیں کہ دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا بھروچ کے قیام پر نصف صدی (پچاس سال) کا عرصہ بہ حسن وخوبی بیت چکا ہے اور وہ اپنی عمر کی اکاون ویں منزل میں نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ داخل ہونے جارہا ہے۔ **فللہ تعالی الحمد اولا و آخرا۔**

اس درمیان طالبان علم نبوت کے کئی قافلے آئے، یہاں خیمہ زن ہوئے، اپنی علمی تشنگی بجھائی اور دور دراز کے علاقوں میں پھیل کر **لیتفقھوا فی الدین و لینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم** کے مطابق زمانے کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے **لعلھم یحذرون** کو مستحضر رکھتے ہوئے دین کی خدمت میں مصروف ہوگئے، آج پھر کچھ لمحوں کے لیے بکھرے ہوئے موتی اور لعل وگوہر یہاں جمع ہیں، اللہ تعالی ہمارے مل بیٹھنے کو با مقصد بنائے، یہ جلسہ جشن کے طور پر نہیں بلکہ ماضی سے عبرت وموعظت، حال کا جائزہ اور نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ بزرگوں کے ارشادات کی روشنی میں مستقبل کی صحیح تعمیر کے لئے لائحہ عمل طے کرنے کے لئے

بلایا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ عالی میں یہ دعا بھی ہے کہ وہ اس تقریب سے ہمارے لیے کام کرنے کی نئی راہیں کھولیں اور ہم زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کا عزم لے کر یہاں سے جائیں، اس سلسلہ میں کچھ باتیں آپ حضرات کے گوش گزار کرنا مناسب سمجھتا ہوں، امید ہے کہ **وذکر فان الذکری تنفع المؤمنین** کے پیش نظر ان کی طرف توجہ فرمائیں گے۔

بعثت نبوی کے تین مقاصد:

قال اللہ تعالیٰ: يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تین وصف نعمائے الٰہیہ کے ضمن میں بتلائے گئے ہیں: ایک تلاوت آیات قرآن، یعنی قرآن پڑھ کر سنانا۔ دوسرے ان کو ظاہری اور باطنی ہر طرح کی گندگی اور نجاست سے پاک کرنا جس میں بدن اور لباس وغیرہ کی ظاہری پاکی بھی داخل ہے، اور عقائد واعمال اور اخلاق وعادات کی پاکیزگی بھی۔ تیسرے تعلیم کتاب وحکمت۔ یہ تینوں چیزیں امت کے لئے حق تعالیٰ کے انعامات بھی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے مقاصد بھی۔

چونکہ امت محمدیہ علی صاحبہا السلام کے علماء کرام کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ نہایت عظیم بشارت ومژدہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا **"العلماء ورثة الانبیاء"** کہ ہماری امت کے علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، اس لئے علماء کی ذمہ داری ہے کہ ان تینوں مقاصد یعنی آیات اللہ کی تلاوت، تزکیہ نفوس اور کتاب وحکمت کی تعلیم وتعلم کو احسن طریقہ سے انجام دیں اور درحقیقت یہی حضرات علماء ربانیین کہے جانے کے مستحق ہیں جن کے متعلق یہ ارشاد پاک ہے:

وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ (آل عمران:۷۹)

لیکن تم لوگ اللہ والے بن جاؤ بوجہ اس کے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور بوجہ اس کے کہ پڑھتے ہو۔

اس آیت کی توضیح کے سلسلے میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ یوں رقمطراز ہیں:

قرآن مجید کی یہ آیت بھی ایک مستقل معجزہ ہے بلکہ معجزات کا مجموعہ ہے، اللہ تعالی فرماتا ہے کہ ''وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ'' لیکن تم لوگ اللہ والے بن جاؤ، پھر اس کے لئے بھی اللہ تعالی نے ربانیین کا لفظ استعمال کیا ہے اس میں تربیت بھی داخل ہے، یعنی وہ عالم جو ایک طرف اللہ رب العزت سے تعلق رکھتا ہو اور اس سے اس کا تعلق صحیح ہو، اخلاص اس کو حاصل ہو، اور دوسری طرف اس کو ایمان واحتساب کا درجہ حاصل ہو، یعنی وہ دعوت وتربیت اور اصلاح کی طرف بھی متوجہ ہو۔

میں عربی زبان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے نہیں جانتا کہ کوئی لفظ اتنا جامع ومعنی خیز اور ایسا توجہ طلب اور نظر افروز ہوسکتا ہے، علمائے امت اور علماء اسلام کو اللہ تعالی ربانیین کے لفظ سے یاد کرتا ہے، ''اللہ والے بنو'' لیکن اللہ تعالی کی صفت میں ''رب'' کا لفظ انتخاب فرمایا گیا کہ ایسے علماء بنو جن کے اندر تربیت کا مادہ ہو، تربیت کی صلاحیت بھی ہو، انہیں کو علمائے ربانیین کہتے ہیں۔ حقیقت میں علمائے ربانیین وہ ہیں ''وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ'' کہ اللہ تعالی ان سے دین کی تعلیم کا بھی کام لے اور دین کی اشاعت کا بھی اور اصلاح کا بھی اور شریعت پر اور سنت پر عمل کرنے کا بھی، اور جو چیز ان کی امتیازی ہے وہ ایمان اور احتساب ہے اور یہی ربانیین کے لئے ضروری ہے کہ جو کام بھی کیا جائے اللہ تعالی کی رضا کے لئے کیا جائے، اللہ کی قدرت اور استعانت پر یقین کرتے ہوئے بھی اور پھر اجر وثواب کی لالچ سے کیا جائے۔

پھر اس کے بعد فرمایا کہ ''بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ

تَدْرُسُوْنَ'' کہ تم دوسروں کو کتاب کی تعلیم دو، اس کے ساتھ ''تَدْرُسُوْنَ'' کا لفظ بھی لگا یا گیا جو ہمارے اور آپ سب کے لئے قابل غور ہے کہ مطالعہ جاری رہے، استفادہ اور علمی سفر جاری رہے، علمی ترقی جاری رہے۔ (قرآنی افادات: ص/ ۲۷۴)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مسائل سلوک میں تحریر فرمایا ہے کہ:

''إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا''۔ روح المعانی میں ہے : جو حق تعالی کی ذات وصفات جلیلہ اور افعال حمیدہ وشیون جمیلہ کو جانتے ہیں، نہ وہ جو محض صرف ونحو جانتے ہیں، سو خشیت کا مدار پہلا علم ہے نہ کہ دوسرا علم۔ (مسائل سلوک حاشیہ بیان القرآن)

حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ اس آیت کے لطائف واسرار کے ضمن میں یوں رقمطراز ہیں:

قال اللہ تعالی: ''إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا'' جز ایں نیست کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء اللہ سے ڈرتے ہیں، اس آیت میں علماء سے وہ لوگ مراد ہیں جن کو اللہ کی عظمت اور جلال کا اور اس کے احکام اور اوامر اور نواہی کا علم ہو اور پھر وہ اللہ تعالی کے حکموں پر چلتے ہوں، جس درجہ کا علم ہوگا اسی درجہ کا ان کو خوف ہوگا، خشیت خداوندی علم اور معرفت پر موقوف ہے۔ علم خشیت کے لئے شرط ہے مگر علت تامہ نہیں جیسے طہارت نماز کے لئے شرط ہے مگر نماز کے لئے علت تامہ نہیں اور جس علم کے بعد خوف خداوندی حاصل نہ ہو تو سمجھ لو کہ وہ علم اللہ کے نزدیک معتبر نہیں اور ایسے عالم جو اللہ سے نہ ڈرتے ہوں وہ اللہ کے نزدیک عالم نہیں اگر چہ دنیا ان کو علامہ کہتی ہو۔ ؎

علم چندآنکہ بیشتر خوانی = چوں عمل درتو نیست نادانی

یعنی علم چاہے جتنا بھی حاصل کرلو مگر جب اس پر عمل نہیں تو نادان ہی ہو۔

نیز علم سے وہ علم مراد نہیں جو محض قال کے درجہ میں ہو بلکہ وہ علم مراد ہے جو حال کے درجہ میں ہو اور ظاہر وباطن اس کے رنگ میں رنگین ہوگیا ہو ''وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً''

علم را بر دل زنی یارے بود　　علم را بر تن زنی مارے بود

جان جملہ علمہا این است این　　کہ بدانی من کیستم در یوم دین

یعنی علم کو اگر دل کے سنوارنے میں صرف کروگے تو وہ تمہارے لئے یارومددگار ثابت ہوگا، اور اس کو بدن کے زیب وزینت کا ذریعہ بناؤ گے تو وہ تمہارے لئے سانپ ثابت ہوگا، تمام علوم کی جان بس یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھ لے کہ قیامت کے دن میرا کیا درجہ ہے۔

حالات کا نیا رُخ اور علمائے دین کی ذمہ داری:

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ۔

معلوم ہوتا ہے کہ ''توریث'' یعنی نائبین انبیاء اور حاملین کتاب کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، اس طرح وارثینِ انبیاء اس امانت کے حاملوں اور دین کے نمائندوں کی بڑی ذمہ داری ہے، اس دین کے بارے میں بھی، اپنے ماحول ومعاشرے اور اپنے ملک کے بارے میں بھی اور پوری انسانیت کے بارے میں بھی جس کی قسمت دین صحیح اور آسانی تعلیمات سے وابستہ ہے، اسی حقیقت کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ تحریف الغالین و انتحال المبطلین و تاویل الجاھلین۔ (مشکوٰۃ: ص/۳۸، فصل ثانی، روایت از بیھقي)

ترجمہ: اس علم کے ہر نسل میں ایسے عادل ومتقی حامل ووارث ہوں گے جو اس دین سے غلو پسند لوگوں کی تحریف، اہل باطل کے غلط انتساب ودعوت اور جاہلوں کی دور از کار تاویلات کو دور کرتے رہیں گے۔

وارثین کتاب، نائبین انبیاء اور عام فہم الفاظ ہیں، ''علمائے دین'' کی یہ اتنی بڑی ذمہ داری اور اتنا نازک معاملہ ہے کہ اگر اس کا صحیح طور پر ادراک ہو تو جن لوگوں کو اللہ نے یہ

شرف عطا فرمایا ہے اوران کے کاندھوں پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے،ان کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں،راتوں کی نینداڑ جائے اور کھانے پینے کی لذت ختم ہوجائے اوران کاسکون ہمیشہ کے لئے جاتارہے۔

مدارس کے فضلاء،اساتذہ اورطلبہ کے لئے ضروری ہوگیاہے کہ وہ اپنے اخلاق اور سیرت وکردارمیں بھی ممتاز ہوں،اخلاص وتعلق مع اللہ میں بھی کھلا ہواامتیاز رکھتے ہوں،ان کا مطالعہ بھی وسیع ہواور وہ عصر حاضر کی زبان اور اسلوب پر بھی قدرت رکھتے ہوں اور جدید ذہن کی ساخت ومشکلات کو بھی سمجھتے ہوں، اس مجموعی اخلاقی ،روحانی ،علمی وفکری بلندی وامتیاز کے بغیر وہ اس عہد انقلاب اوراس دورِفتن میں جس میں خود ہماری کمزوریوں اور جدید واقعات نے علمائے دین کے وقار کومزید مجروح اور دین اور علم پر اعتماد کومزید متزلزل کردیا ہے،نیابت انبیاءاوروارثین کتاب کی ذمہ داری ادانہیں کرسکتے ،ذمہ داری پچھلے عہد سے بھی بڑھ گئی ہے،یہ کسی ایک جماعت وعلماء،کسی ایک ادارے ومدرسہ کا مسئلہ نہیں،اس ملک میں دین وعلم کے مستقبل اورملت کے دین پر اعتماداورشریعت وعلوم دین سے ارتباط کا مسئلہ ہے، خدا کرے ہم اپنی ذمہ داری محسوس کریں اوراس کوادا کرنے کی مخلصانہ اورسرفروشانہ کوشش میں لگ جائیں۔

رہبری ورہنمائی: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ’’عالم‘‘ کو چاند سے تشبیہ دی ہے، چاند کا کام کیاہے؟ اندھیروں کوروشن کرنا،راہ گیروں کے لیے راستے کی پہچان کوآسان کرنا، راہ بھٹکے ہوؤں کوگم گشتہ راہی سے بچانااوراپنا سینہ جلا کرایک عالم کوروشنی پہنچانا۔

’’عالم‘‘ کوچاند سے تشبیہ دینے میں واضح اشارہ ہے کہ وہ امت مسلمہ؛ بلکہ پوری انسانیت کے لیے رہنمائی کا فریضہ انجام دے،عالم اپنے سماج اورمعاشرہ کے لیے قبلہ نما کی حیثیت رکھتاہے، کہ اس کو دیکھ کرعوام اپنے قبلۂ مقصودکوجان سکیں؛اسی لیے عابد کے مقابلے میں اس کی فضیلت زیادہ ہے کہ عبادت کرنے والے کا جوکچھ نفع ہے،وہ عابد کی ذات تک

محدود رہتا ہے، جب کہ ''عالم'' تو چاند ہے، جس کی روشنی سے پوری دنیا مستفید ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۱۴ - ۱۹۹۹ء) نے ایک تقریر میں طالبان علوم نبوت کی ذمہ داری پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا تھا:

''......آپ کا کام سب سے زیادہ نازک اور عظیم ہے، میں نہیں جانتا کہ اس وقت دنیا کی کسی جماعت یا کسی گروہ کا کام اتنا نازک، وسیع اور اہم ہے''۔ (پاجا سراغ زندگی، ص:۶۸)

غیر متزلزل یقین: امت کی رہبری و رہنمائی کے لیے جن صفات کی ضرورت ہے، ان میں نمایاں وصف ''غیر متزلزل یقین'' ہے، کہ اس کے بغیر کوئی عالم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، اگر کوئی اپنے مشن کے تئیں یقین کامل رکھتا ہو، اخلاص کی دولت سے مالا مال ہو، اس نے خشت و سنگ سے زیادہ قلب وفکر کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی ہو، اس کا ایک سرا نبوت محمدی سے ملا ہو اور دوسرا سرا زندگی اور اس کی مشکلات و مسائل کو حل کرنے سے، جامعیت اس کا شعار ہو، آہ سحر گاہی میں اس کی آنکھیں ابلتی ہوں، امت کے درد میں دل بے تاب رہتا ہو، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے امت کی سرفرازی و بلندی کا کام نہ لے۔

حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے طالبان علوم نبوت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

آپ کا ایک سرا نبوت محمدی سے ملا ہوا ہے، دوسرا سرا زندگی سے، یہی آپ کے کام کی نزاکت، آپ کی عظمت کی دلیل ہے، نبوت محمدی سے وابستگی اور اتصال جہاں ایک بہت بڑی خوش نصیبی اور سرفرازی ہے، وہاں ایک عظیم ذمہ داری بھی ہے، آپ کے پاس حقائق اور عقائد کی سب سے بڑی دولت اور سب سے عظیم سرمایہ ہے، اس وابستگی سے آپ پر چند ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، آپ میں غیر متزلزل یقین اور راسخ ایمان ہونا چاہیے، آپ میں یہ حوصلہ اور ہمت ہونی چاہیے کہ ساری دنیا ملتی ہو، تو اس کے ایک نقطہ سے بھی دست بردار ہونے کے سوال پر غور نہ کر سکیں، آپ کے دلوں میں اس کی حمایت و نصرت کا جذبہ موجزن

ہونا چاہیے، آپ کا دل اس بے بدل دولت پر فخر اور شکر سے لبریز ہو، آپ کو اس کی صداقت، اس کی معقولیت، اس کی ابدیت، اس کی ہر زمانے میں صلاحیت، اس کی بلندی و برتری اور اس کی معصومیت پر غیر متبدل یقین ہو، آپ اس کے مقابل ہر چیز کو پورے اطمینان کے ساتھ جاہلیت کی میراث سمجھتے ہوں، آپ جہاں احکام خداوندی اور تعلیمات اسلامی کو سن کر "**سمعنا و اطعنا**" کہیں، وہاں جاہلیت کے نظام اور جاہلیت کے علم برداروں کو مخاطب کر کے کہیں کہ "**كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ**"۔

آپ اسلام ہی کی رہنمائی اور اسوۂ محمدی ہی کی روشنی میں دنیا کی نجات کا یقین رکھتے ہوں اور آپ کا اس پر عقیدہ ہو کہ اس طوفان نوح میں سفینۂ نوح صرف محمد ﷺ کی نبوت اور امامت ہے، آپ یقین کرتے ہوں کہ افراد اور قوم کی سرفرازی اور سربلندی کی شرط صرف رسول اللہ ﷺ کا اتباع ہے۔...... آپ تعلیمات نبوی کو علم کا لب لباب اور حقیقۃ الحقائق سمجھتے ہوں، آپ اس کے مقابلے میں تمام دنیا کی الٰہیات اور فلسفہ مابعد الطبعیات اور قیاسات و روایات کو افسانہ و خرافات سے زیادہ وقعت دینے کے لیے تیار نہ ہوں، آپ توحید کی حقیقت سے واقف اور اس پر مصر ہوں اور شرک اور تمام دنیا کے علم الأصنام کو- خواہ وہ کیسے ہی پُر جلا، علمی اصطلاحات اور فلسفہ کی زبان میں بیان کیا گیا ہو- حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں، اور "**زخرف القول غرورا**" سے زیادہ مرتبہ دینے کے لیے آمادہ نہ ہوں، آپ سنت کے اتباع کے حریص، اور "**خیر الھدی ھدی محمد صلی اللہ علیہ و سلم**" پر یقین رکھتے ہوں اور بدعات کے مضر اور نامقبول ہونے پر شرح صدر ہو، غرض آپ اعتقادی، ذہنی، فکری، قلبی، ذوقی اور عملی حیثیت سے نبوت محمدی کی جامعیت اور عملیت کے قائل اور اس کی عملی تفسیر ہوں۔ (پاجا سراغ زندگی، ص: ۹۶-۹۷)

ایمان کا تحفظ: ایمان کی عظیم ترین دولت جسے حاصل ہو جائے، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ایمان کو باقی رکھنے، ترقی دینے اور اس کے شجر کو ثمر آور بنانے کے لیے ہر لمحہ کوشش کرتا رہے، ایمان کے حاصل ہو جانے کے بعد بالکل مطمئن نہ ہو جائے۔ جو دولت

جتنی عظیم ہوتی ہے، اس کے دشمن اس پر اسی قوت کے ساتھ حملہ کرتے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ ایمان پر ثابت قدمی کی دعاء کیا کرتے تھے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يكثر أن يقول: يا مقلب القلوب ثبت قلبي على دينك. (سنن الترمذي: ٢١٤٠، أبواب القدر، باب ما جاء أن القلوب بين أصبعي الرحمن)

''اللہ کے نبی ﷺ بہ کثرت یہ (دعاء) فرماتے: اے دلوں کے الٹ پھیر کرنے والے! میرے قلب کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھیے۔''

اس دور میں دین وایمان کے لیے کچھ زیادہ ہی خطرات پیدا ہو گئے ہیں، پوری دنیا حتیٰ کہ مسلم اکثریتی ملکوں اور علاقوں میں بھی الحاد وارتداد کی تیز وتند ہوائیں چل رہی ہیں، ہم نے اپنے بچوں کے دل ودماغ میں ایمان کی قدر وعظمت نہیں بٹھائی؛ اس لیے ان کا فکری اغوا کر لیا جاتا ہے، عیسائی مشنریز، قادیانی مشنریز، اور ہندو احیائی تحریکیں انہیں اپنا لقمۂ تر بناتی جا رہی ہیں۔

مسلمانوں میں عیسائی مشنریز اور دوسری غیر مسلم مشنریز کی چراگاہیں: دو طبقے ہیں، ایک تو وہ مسلمان ہیں، جو فقر وفاقہ کی مار جھیل رہے ہیں اور ان کی اعانت وامداد کرنے سے مسلمان اہل ثروت غافل ہیں اور دوسرے وہ نوجوان ہیں، جن کے دل میں اسلام کی عظمت و قدر نہیں بٹھائی گئی ہے، وہ اسلام کے تعلق سے ابتدائی ضروری معلومات سے بھی ناآشنا ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: عیسائی مشنریز کی سرگرمیاں اور مسلمان، از: حضرت مولانا عتیق احمد بستوی، ص: ۱۳)

ان حالات میں علماء کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنے اردگرد تیزی سے پھیل رہے ارتداد کی روک تھام میں کامل درجہ کی جدوجہد سے کام لیں، جہاں تک ہو سکے ارتداد پھیلنے کے حقیقی اسباب کا مطالعہ کریں، حالات کا صحیح تجزیہ کریں اور اس کے حل کی کامیاب

کوشش کریں۔

اس محاذ پر کام یا تو نہیں ہو رہا ہے، یا کام کی رفتار اور اس کا معیار بہت ہی کم ہے، ہم بعض فروعی مسائل میں الجھے ہوئے ہیں اور ہمارے گرد و پیش ایمان کا سودا ہو رہا ہے، ہمارے بچے دین و ایمان کی قدر و قیمت سے بالکل نا آشنا ہیں، انہیں کلمہ طیبہ تک یاد نہیں ہے، وہ ایمان کی حقیقت اور اس کے تقاضوں سے بالکل بے خبر ہیں، جب یہ مشنری اسکولوں یا لادینی ماحول والے کالج و یونی ورسٹی میں تعلیم پاتے ہیں، تو کوئی نہ کوئی مشن اسے بہ آسانی اپنا شکار بنالیتا ہے۔

۳-خلق خدا کی خدمت اور نفع رسانی: اسلام دین رحمت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رحمۃ العالمین ہیں، مخلوق کی خدمت اور نفع رسانی اسلام کا اہم پیغام ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے: **الراحمون يرحمهم الرحمن، ارحموا أهل الأرض، يرحمكم من في السماء.** (سنن أبي داؤد: ٤٩٤١، باب في الرحمة، كتاب الأدب)

رحم کرنے والوں پر رحمان رحم کرتا ہے، تم اہل زمین پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ جو شخص دنیا میں کسی شخص کی مصیبت کو دور کرے گا، اس کے بدلے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی مصیبت کو دور فرمائیں گے۔ اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ جو شخص کسی انسان کی مدد میں لگا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتے رہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ کو پریشانی لاحق ہوئی، تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جن چند کلمات کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تسلی دی، ان میں بہ طور خاص اس بات کا تذکرہ کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز رسوا نہیں کریں گے؛ کیوں کہ آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، ناداروں کی کفالت کرتے ہیں، مہمانوں کی خاطر داری کرتے ہیں اور حق کی ضرورتوں میں مدد کرتے ہیں۔

اس محاذ پر کام کرنے کے واسطے علماء کے لیے وسیع میدان ہے: قدرتی آفات ؛ زلزلہ، قحط سالی اور وباء یا جنگی تباہ کاریوں کے موقع پر انسانی ، رفاہی اور طبی خدمات کے ذریعے انسانی قلوب کو اپنی طرف متوجہ کیا جاسکتا ہے، اس میدان کے ذریعے عیسائی مشنریاں اپنے لیے لوگوں کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کرنے میں مصروف ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کو اس میدان میں دوسروں کی شرکت برداشت نہیں ہے، وہ نہیں چاہتے ہیں کہ اس میدان میں کوئی اور تنظیم اپنی موجودگی درج کرائے ،ان کی کوشش اور ہماری غفلت کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی تنظیم اس میدان میں برائے نام ہے، حیرت اور اس سے بڑھ کر شرمندگی کی بات تو یہ ہے کہ عالمی طور پر آفات کی مار جھیل رہے لوگوں کے لیے مسلم ممالک کی امداد بھی ریڈ کراس اور دیگر عیسائی مشنریاں کے ذریعے تقسیم ہوتی ہے۔

ہمارے ملک ہندوستان میں بعض تنظیمیں یقیناً اس حوالے سے قابل قدر کام کر رہی ہیں ؛لیکن اس قدر کام شاید کافی نہیں ہے۔

موجودہ دور میں خدمت خلق کے دو اہم ذرائع ہیں: علاج اور تعلیم۔ ان دونوں میدان میں عیسائی مشنریاں اس قدر فعال ہیں کہ کمرشیل اور تجارتی بنیاد پر کام کر رہے ہسپتال اور تعلیم گاہ کے مقابلے میں عیسائی مشنریز کے زیر انتظام چلنے والے ہاسپیٹل اور تعلیم گاہ کا معیار کافی بلند ہوتا ہے،عیسائی مشنریز دواخانوں اور تعلیم گاہوں کو نہایت کامیابی و چالاکی کے ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کے لیے استعمال کر رہی ہے، اس کے برعکس مسلمانوں کے ہسپتال بھی کم ہیں اور تعلیم گاہ بھی برائے نام ہے، اور جو کچھ اس نام پر وجود میں آئے ہیں، ان میں تجارت اور پروفٹ کی بنیاد اس قدر گہری اور مضبوط ہے کہ بیچارے صحت اور تعلیم کے خواہاں مانوس تو کیا ہوتے ،متنفر ہوجاتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ No Profite No Loss (نو پروفٹ نو

لاس) کی بنیاد پر تعلیم گاہیں اور دواخانے قائم کیے جائیں، جن میں بلا تفریق مذہب وملت ہر ایک کی خدمت کی جائے، یہ ادارے مذہبی عناصر اور تبلیغی تحریک سے اس طرح مربوط ہوں کہ غیر محسوس طریقے سے ان سے مذہب اسلام کی تبلیغ واشاعت کا کام لیا جائے، ان اداروں کے نظم ونسق سے علماء وابستہ ہوں گے، تو یقیناً کم خرچ میں عمدہ نتیجہ برآمد ہوگا۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم رقم طراز ہیں:

اس وقت علماء نے عام طور پر مساجد ومدارس، دارالافتاء ودارالقضاء اور وعظ وتقریر نیز تصنیف وتالیف کی ذمہ داریاں سنبھال رکھی ہیں، یقیناً یہ بہت اہم کام ہیں؛ لیکن عام مسلمانوں اور غیر مسلموں تک رسائی اور ان تک اللہ کے دین کو پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ علماء؛ خدمت خلق کے میدان میں اتریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس سنت کو بھی اپنے لیے مشعل راہ بنائیں، اس سے دو بڑے فائدے ہوں گے: ایک یہ کہ ان کاموں کا تجارتی رخ بننے کے بجائے جذبہ خدمت کی کیفیت ان میں زیادہ نمایاں ہوگی، غریبوں، پسماندہ لوگوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکے گا، دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ یہ ادارے دعوتی اور تبلیغی کام میں معاون بن سکیں گے، نہ صرف عام مسلمانوں؛ بلکہ غیر مسلم بھائیوں میں بھی کام کا موقع بہم پہنچے گا اور اسلام جس جذبہ کے تحت خدمت خلق کے کام کی تائید کرتا ہے، اس جذبہ کے مطابق خدمت انسانیت کا کام ہوگا۔ یہ وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے اور علماء کو اس جانب توجہ کرنا چاہیے۔ بحمد اللہ کہیں کہیں علماء نے اس سلسلے میں قدم بڑھائے ہیں، فنی تعلیم کے ادارے قائم کیے ہیں، عصری تعلیم کی درگاہیں قائم کی ہیں، یا ہسپتال کھولے ہیں، اگر ملک کے مختلف علاقوں میں علماء خدمت خلق کے ادارے قائم کریں، قدرتی حادثات کے موقع پر ریلیف کے کاموں میں آگے بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، اور اپنے اس کام میں اسلامی اخلاق، جذبۂ خدمت اور مقصد دعوت کو ملحوظ رکھیں، تو اس کے نہایت ہی گہرے اثرات مرتب ہوں گے اور جیسے علماء نے مساجد ومدارس کے واسطہ سے عوام میں رسوخ حاصل کیا ہے، کہ مسلمانوں کی کوئی تحریک اس کی شمولیت کے بغیر کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو پاتی، اسی طرح وہ غیر مسلم بھائیوں اور دین سے بے بہرہ مسلمانوں میں بھی رسائی حاصل کرلیں گے۔ (دینی وعصری درسگاہیں۔ تعلیمی مسائل، ص۸۱-۸۲)

ترجیحی بنیاد پر دیہات میں اپنی خدمات فراہم کریں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعض اقوال میں علماء کو چاند سے تشبیہ دی ہے اور بعض روایتوں میں انہیں ستاروں کے مانند قرار دیا گیا ہے، اس سے اس جانب اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علم کا دائرہ اور ان کی فیض رسانی کا حلقہ کسی ایک علاقہ کے لیے مخصوص نہیں؛ بلکہ اس کا دائرہ چاند اور ستاروں کی مانند غیر محدود اور وسیع سے وسیع تر ہے۔

ایسا نہیں دیکھا گیا کہ چاند اور ستارے شہر کی پر رونق آبادیوں میں اپنی روشنی بکھیرتے ہوں اور دیہات کی تنگ اور میلی کچیلی پگڈنڈیوں سے آنکھیں موند لیتے ہوں، یہی بات نوجوان فضلاء کے سوچنے کی ہے، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ علماء کی ساری سرگرمیاں شہر کی حد تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔

جب کہ دیہات میں کام کی زیادہ ضرورت ہے، اللہ کا فضل ہے کہ گجرات کا یہ علاقہ جہاں ہم ہیں، کسی قدر غنیمت ہے، دوسرے علاقے کے بہت سے دیہات ایسے ہیں، جہاں جنازہ کی نماز پڑھانے والا میسر نہیں ہے، اور بہت سی لاشیں بغیر نماز کے دفن کر دی جاتی ہیں، کہیں قادیانیت حملہ زن ہے، تو کہیں عیسائی مشنریز اور ہندو احیائی تحریکیں مسلمانوں کو مرتد بنانے پر کمر بستہ ہیں، جہالت کا یہ عالم ہے کہ بعض حضرات کلمہ طیبہ تک سے واقف نہیں ہیں، انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کن سے رشتۂ نکاح قائم کرنا جائز ہے اور کن سے ناجائز، نتیجہ یہاں تک پہنچتا ہے کہ ماموں اور بھانجی آپس میں نکاح کر کے معاشرہ میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔

ان حالات میں ان کی اصلاح و ہدایت کی ذمہ داری آخر کن پر عائد ہوتی ہے؟ جب علماء صرف شہروں کو اپنی سرگرمی کا میدان بنائیں گے، تو کیا ان دیہاتوں میں اسلام مخالف طاقتیں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کی کوشش نہیں کریں گی۔ آخر اس صورت حال کی ذمہ داری کن پر عائد ہوتی ہے اور اس کا حل اس کے سوا اور کیا ہے کہ علماء دیہات اور ناخواندہ علاقوں کی طرف متوجہ ہوں، وہاں اپنی اصلاحی کوششیں تیز سے تیز تر کریں، تا کہ غیر اسلامی

مشنریز کو کام کرنے کا موقع نہ ملے، کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ امریکہ اور لندن کے ماحول میں پلا بڑھا نوجوان تو عیسائی مشنریز سے وابستہ ہو کر دیہات میں رہنا پسند کرے، ناحق دین کی تبلیغ و اشاعت کرے، اس کی خاطر انتہائی پسماندہ اور بدسلیقہ، کالی کلوٹی لڑکی سے نکاح کو گوارہ کرے، تاکہ وہ اس کے مشن میں ہاتھ بٹائے ؛لیکن دین کے حقیقی خادم کو برحق دین کی تبلیغ و اشاعت کی خاطر معمولی راحت و آرام کی قربانی دینے اور دیہات میں قیام کرنے میں تامل ہو؟؟؟

اگر ہم دین حق کے سپاہی ہیں اور اسی قافلے سے تعلق رکھتے ہیں، جس نے دین کی احیاء کی خاطر اپنی سردھڑ کی بازی لگادی، راحت و آرام کو دین کی بقاء اور ارتقا کے لیے قربان کردیا، کہیں بالاکوٹ کی پہاڑی پر تو کہیں شاملی کے میدان میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا، تو ہمیں بھی راحت و آرام کا نذرانہ پیش کرنا ہوگا، ہمیں بھی شہر کی رونق کو الوداع کہہ کر دیہات میں اقامت اختیار کرنی ہوگی اور دین حق کے حقیقی چوکیدار بن کر دیہات کی راہ سے آنے والے ہر حملے کا جواب دینا ہوگا، ورنہ ہمارے دشمن ہماری زمین کو فتح کرنے میں ذرا بھی تاخیر سے کام نہیں لیں گے۔

دیہات میں مکاتب کے نظام کو مضبوط کرنا اور اسکول کی راہ سے آنے والی گمراہی کا سد باب کرنا اس وقت علماء کے لیے چیلنج سے کم نہیں ہے۔

حلم و بردباری کا مظاہرہ: دیہات میں کام کرنے کے لیے پتھر کا جگر چاہیے، کہ وہاں سابقہ ایسے افراد سے ہوتا ہے، جو عموماً تہذیب و تمدن سے عاری، ہر معاملے میں ضد کرنے والے اور ہٹ دھرم ہوتے ہیں، ان کو کوئی بات سمجھائی جائے، تو اوٹ پٹانگ جواب دیتے ہیں، ایسے میں حلم و بردباری کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا' درحقیقت اپنے مشن کا اپنے ہاتھوں گلا گھونٹنے کے مرادف ہے، حضرات انبیاء کرام کی بعثت جن علاقوں میں اور جن اقوام میں ہوئی، ان کا مطالعہ کیجیے، معلوم ہوگا کہ ان کی افہام و تفہیم کے جواب میں ان کی قوم

کس طرح جواب دیتی تھی، قرآن کریم کا بیان ہے کہ انبیاء کرام کو ان کی قوم نے سفیہ، مجنون اور بے وقوف تک کہنے سے دریغ نہیں کیا؛ لیکن حضرات انبیاء نے کیسا جواب دیا،: **"یقوم لیس بي سفاهة"** اے میری قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں، مجھے مرض جنون لاحق نہیں ہے، اس کا اثر یہ ہوا کہ سخت سے سخت مخالف بھی ان کے غلام ہو گئے۔

حضرات اکابر کی تاریخ پڑھ جایئے، ان کی صبر و تحمل کی داستان کو نگاہوں میں بسایئے، اور اسی صبر کا مظاہرہ کیجیے، بدسلیقہ اور پھوہڑ بھی آپ کے دیوانے ہوں گے، آپ کی باتوں کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنائیں گے اور آپ کے مشن میں آپ کا مکمل تعاون کریں گے۔

کسی بھی فن میں اختصاص: موجودہ دور میں، کہ علم و ہنر کا قافلہ ہر دم رواں دواں ہے، نئی نئی ترقیات نے علم وفن کے نئے نئے گوشے وا کر دیے ہیں، زندگی کی تمام سمتوں میں تازہ بہ تازہ ان گنت اکتسابات کا سلسلہ جاری ہے، ذرائع ابلاغ کی ساحرانہ؛ بلکہ معجزانہ فتوحات نے تو پوری دنیا کو "گھر آنگن (Globel Village) بنا کر رکھ دیا ہے، ایسے میں چند باتوں کی معلومات سے کوئی شخص انقلابی کام نہیں کر سکتا ہے، ضرورت ہے اس بات کی کہ ہر فن میں ماہرین تیار ہوں، جو زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر درد کا مداوا کریں، شکوک وشبہات میں الجھی ہوئی انسانیت کو معقول اور فطری انداز میں حقائق معارف سے روشناس کرائیں، بے قرار اور بے سکون زندگی میں سکون بھرنے کی کوشش کریں، ظاہر ہے کہ کسی بھی فن کے چند حروف پڑھ لینے سے یہ کام نہیں ہو سکتا، خدمت کا جونسا بھی میدان منتخب کیا جائے، اس کے پیچ وخم سے مکمل واقفیت حاصل کی جائے، اس میں اختصاص پیدا کیا جائے، کہ بغیر اختصاص اور اسپیشلائزیشن کے آج کے ترقی یافتہ دور میں کسی مشکوک ذہن کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ نے طلبہ کے درمیان تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

''اس وقت جو عام ذہنی انتشار اور ایک قسم کی مایوسی ملت پر پھیل رہی ہے اور ملت کی صلاحیت کی طرف سے اور دین میں جو صلاحیت ودیعت کی گئی ہے، اس صلاحیت کی طرف سے یا دین کے مستقبل کی طرف سے جو بدگمانی اور بداعتمادی پیدا ہو رہی ہے، نوجوانوں میں، جدید تعلیم یافتہ طبقوں میں اور دین کے حاملین میں جو بے اعتمادی پھیل رہی ہے، اس کو دور کرنے کے لیے بہت زیادہ تیاریوں کی ضرورت ہے، اس سے بہت زیادہ علمی فتوحات حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اس سے بہت زیادہ بلند پروازیوں کی ضرورت ہے، اس سے بہت زیادہ کاوشوں؛ دل سوزیوں اور دماغ سوزیوں کی ضرورت ہے، جو ہمارے اسلاف نے کیں''۔ (پاجا سراغ زندگی، ص: ۸۳-۸۴)

اعتدال: مذہب اسلام افراط وتفریط سے پاک ایسے پیغام کا داعی ہے، جس کی بنیاد ''اعتدال'' پر ہو، ''اعتدال'' اللہ کی بیش بہا نعمت اور اہل سنت والجماعت کا امتیاز رہا ہے، اگر کسی بھی شئے میں بے اعتدالی پیدا ہو جائے، تو وہ انسانیت کے لیے بجائے کارآمد اور نفع بخش ہونے کے مضر اور نقصان دہ ثابت ہوتی ہے، ہوا کی ضرورت اور پانی کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے، لیکن جب یہ دونوں حد اعتدال کو عبور کر جائیں، تو انسانیت کو طوفان اور سیلاب کی مار جھیلنی پڑتی ہے، معلوم ہوا کہ کسی بھی چیز میں اعتدال ہی فطرت کا تقاضہ ہے، بداعتدالی حد درجہ نقصان دہ اور مضرت رساں ہے۔

فکر و عمل میں اعتدال سے انسان کارآمد انسان بنتا ہے، جب کہ ان میں بداعتدالی اسے بے پناہ نقصان پہنچاتی ہے، عیسائیوں نے رجال اللہ کے بارے میں افراط سے کام لیا، جب کہ یہودیوں نے تفریط سے، قرآن کریم نے اس کے نتیجے میں ایک کو ''ضالین'' کہا اور دوسرے کو ''مغضوب علیہم''۔ یہ حقیقت میں فکری بے اعتدالی کا نتیجہ تھا، مرجیہ نے اعمال کی اہمیت گھٹا دی اور خوارج نے اعمال کی اہمیت میں غلو سے کام لیا، علماء نے دونوں کو اہل سنت والجماعت کی فہرست سے خارج سمجھا، حالاں کہ ان کی ظاہری دین داری میں کوئی کمی نہیں تھی۔ روافض اور ناصبیہ کا بھی یہی حال ہوا، ایک نے اہل بیت کی محبت میں غلو سے کام لیا، تو دوسرے نے تفریط کا راستہ اختیار کیا، اور دونوں گمراہ کہلائے، اہل سنت والجماعت نے اسی

اعتدال کی راہ کو اختیار کیا اور صراط مستقیم پر گامزن رہے، جو شریعت میں مطلوب ہے، اور یہی اکابر علمائے دیوبند کا بھی طریقہ رہا ہے۔

موجودہ دور میں- جب کہ معمولی اختلاف بھی ''نزاع و انتشار'' کی شکل اختیار کرلیتا ہے-اعتدال کی اہمیت اور دوبالا ہوجاتی ہے، اعتدال کا ایک پہلو یہ ہے کہ انسان ہر شئ کو اس کے مقام پر ہی رکھے، نہ اس کے درجہ میں کمی کرے اور نہ ہی زیادتی۔

اعتدال کا پہلو یہ بھی ہے کہ ہم پر جب کوئی نامناسب تبصرہ کرے، تو ہم ردعمل کے طور پر حد سے تجاوز نہ کرجائیں، ایسے موقع پر اپنے آپ کو قابو میں رکھنا آسان نہیں ہوتا؛ لیکن انبیاء کرام کے واقعات ہمارے لیے مشعل راہ ہیں کہ جب ان کی قوم حد درجہ نامعقول اور سخت سے سخت گفتگو کرتی تھی، اس وقت بھی حضرات انبیاء کرام میں منفی ردعمل اور اشتعال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

حکمت و مصلحت اندیشی: مصلحت اندیشی اور زمانہ شناسی کسی بھی مشن کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہے، اگر تو اگرم نہ ہو اور روٹی پکالی جائے، تو ظاہر ہے کہ وہ کھانے کے کام میں نہیں آئے گی؛ اسی طرح اگر زمین نرم نہ ہو اور اس میں بیج ڈال دیا جائے، تو ظاہر ہے کہ پودا نہیں اگے گا، اسی طرح اگر ہم جلد نتائج حاصل کرنے کی خاطر، مدت سے معاشرہ میں جڑ پکڑ چکی بیماری کو یک لخت ختم کرنا چاہیں، تو شاید مطلوبہ نتیجہ برآمد نہیں ہوگا، ہمیں حکمت و مصلحت کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ یہ ضروری ہے کہ انسان جو کہے، حق کہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر حق بات کا ہر وقت اظہار کردے، خود شریعت نے بہت سارے محرمات کو بہ تدریج حرام کیا ہے، اہل علم خوب واقف ہیں کہ شراب تین مرحلے میں حرام ہوئی ہے، کیا اس میں ہمارے لیے سبق نہیں ہے کہ مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے زمانے کے حالات اور تقاضوں کا خیال رکھیں؟

علماء امت کی فکر کریں اوران کو اختلاف وانتشار سے بچائیں: ہمارے لیے جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے، وہ ہے امت کی فکر، اور امت کو اختلاف و انتشار سے بچانا، افسوس صد افسوس کہ ہم اس محاذ پر انتہائی کمزور ہیں، جب ہی تو امت اور علماء امت کے درمیان فاصلے بڑھتے جارہے ہیں، آج نئی نسل ہم سے کٹ چکی ہے اور نہ صرف مغربی تہذیب کو قبول کررہی ہے؛ بلکہ مغربی افکار ونظریات کی حامی ہوتی جارہی ہے، گویا وہ ارتداد کا شکار ہوکر رہ گئی ہے، اور ہم خواب غفلت کے شکار ہیں؛ حالاں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: **من لم يهتم للمسلمين فليس منهم.** (المستدرك على الصحيحين، رقم:۷۹۰۲، کتاب الرقاق) ''جس کو مسلمانوں کے مسائل کی فکر نہ ہو، وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے''۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء اور عوام کے درمیان گہرا ربط ہو، علماء عوام کے کام آئیں، ان کی مشکلات کو دور کریں اور ان کی ہر طرح کی فکر کریں، تا کہ عوام علماء کو اپنا خیر خواہ سمجھنے لگیں۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ درد بھرے انداز میں لکھتے ہیں:

''علماء کا امت سے تعلق محض ایک قانونی تعلق نہیں ہے، بلکہ روحانی اور ایمانی تعلق ہے، قانونی تعلق میں انسان اپنے آپ کو ڈیوٹی تک محدود رکھتا ہے، مقررہ کام کے سوا وہ کوئی اور کام کرنا نہیں چاہتا؛ کیوں کہ اس کا اسے معاوضہ نہیں ملتا؛ لیکن عالم کی حیثیت ایک ایسے چوکیدار کی ہے، جو صرف اللہ کی رضاء کے لیے دین کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے، وہ ملازم نہیں بلکہ رضا کار ہے، اس کے فرائض غیر محدود ہیں، اس کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور وہ تمام امور اس کے فرائض میں داخل ہیں، جو اس امت سے اللہ کو مطلوب ہیں، اگر کوئی شخص فساد عقیدہ میں مبتلا ہو تو اس کے عقیدے کی اصلاح، بے نمازی ہو تو نماز کی دعوت، کسی برائی میں مبتلا ہو تو اس کو برائی سے بچانے کی کوشش، مسلمان خاندان یا شوہر اور بیوی میں اختلاف ہو، تو رفع اختلاف کی سعی، بچوں اور بڑوں کی تعلیم کا انتظام نہ ہو، تو ان کی تعلیم کا انتظام، کوئی آفت سماوی آجائے، تو لوگوں کی مدد کے لیے اٹھ کھڑا ہونا، الیکشن ہو رہا ہو، تو مسلمانوں کے مفاد کی

رعایت کے ساتھ لوگوں کی رہنمائی، اگر وہاں برادران وطن کی آبادی بھی ہو، تو ان کے ساتھ داعیانہ ربط وضبط، فرقہ وارانہ منافرت پھیل رہی ہو، تو امن وامان قائم کرنے کی کوشش، غرض امت کا کوئی مسئلہ ہو، عالم کا فرض ہے کہ وہ کسی دنیوی منفعت کی طمع کے بغیر محض ملی مفاد اور دینی تقاضہ کے تحت اٹھ کھڑا ہو، یہ نہایت اہم ضرورت ہے اور یہی علماء سلف کا طریقہ تھا، افسوس کہ اب فضلاء مدارس نے اپنے دائرۂ عمل کو مسجد اور مدرسہ تک محدود کر دیا، اس کی وجہ سے مسلمانوں میں صالح اور بے لوث قیادت کا خلا پیدا ہو گیا ہے، یہاں تک کہ بعض جگہ جاہل اور غیر سماجی عناصر نے مسلمانوں کے مسائل کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، اوران کے عمل دخل سے جن نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے، وہی نتائج ظہور میں آرہے ہیں''۔ (دینی وعصری درسگاہیں- تعلیمی مسائل، ص:۷۵-۷۶)

دعوت الی اللہ: علماء' انبیاء کرام کے وارث ہیں، اور انبیاء کرام کا اصل کام غیر مسلموں کو اللہ کے دین کی طرف بلانا تھا، قرآن کریم میں مختلف انبیاء کرام کے واقعات ملاحظہ کریں، ان سب میں یہ بات قدرے مشترک ملے گی کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے اولین مخاطب غیر مسلم ہی ہیں، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

''اس میں شبہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد نبوی کے امام وخطیب بھی تھے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اصل مشن گم گشتہ راہ بندوں کو اللہ کی طرف بلانا تھا؛ اسی کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راتوں میں اپنے مالک کے سامنے دست التجاء پھیلاتے تھے، اور دن میں بندگان خدا کی خوشامد کر کے انہیں اللہ کی طرف بلاتے تھے، مکہ کی تیرہ سالہ زندگی کی ہر ساعت اسی مہم میں گذری، پھر صلح حدیبیہ کے بعد سے وفات تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی کام میں لگے رہے، کسی قبیلہ میں خود جاتے؛ کہیں اپنے رفقاء کو بھیجتے، اور بہت سے قبائل وہ تھے، جنہوں نے خود اپنے وفود خدمت اقدس میں بھیجے۔'' (دینی اورعصری درسگاہیں- تعلیمی مسائل، ص:۸۲)

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو خیر امت اس لیے قرار دیا ہے کہ اسے پوری انسانیت

کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے بھیجا گیا ہے، قرآن کریم کا بیان ہے:

۱- كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ.(۳-آل عمران:۱۱۰) ''تم بہترین جماعت ہو، جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہو، تم بھلائی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

۲- وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ.(۳-آل عمران:۱۰۴) ''اور ضروری ہے کہ تم میں سے ایک جماعت (ایسی) رہے، جو نیکی کی طرف بلایا کرے اور بھلائی کا حکم دیا کرے اور بدی سے روکا کرے۔''

ان میں سے پہلی آیت میں مسلمین یا مؤمنین کے بجائے ''ناس'' یعنی پوری انسانیت کا ذکر کیا گیا ہے، جس میں کفار ومشرکین بھی شامل ہیں، بلکہ اہل علم نے لکھا ہے کہ ''یا أیھا الناس'' سے زیادہ تر مشرکین کو مخاطب کیا گیا ہے۔ معروف سے مراد ''ایمان'' اور منکر سے مراد ''شرک'' ہے۔ گویا اس امت کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلمین کو ایمان کی دعوت دیں، اور کفر سے بچائیں، اسی خاص ڈیوٹی کی وجہ سے وہ ''خیر امت'' کے منصب پر فائز ہے۔ علامہ رازی نے تحریر فرمایا ہے کہ اس امت کے خیر امت کی علت اور وجہ یہ ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دینے والی ہے۔

معلوم ہوا کہ اس امت کی اہم ترین ذمہ داری ہے کہ وہ توحید کی امانت سارے انسانوں تک پہنچائیں، انسانیت کو خیر وصلاح کی دعوت دیں، بھلائیوں کا حکم کریں، برائیوں سے روکیں، اللہ کے راستے کی جانب انسانیت کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے شیطانی راہ سے باز رکھیں۔

یہ فریضہ یوں تو اس امت کے ہر فرد پر عائد ہوتا ہے؛ لیکن جس کا درجہ جس قدر

بڑھا ہوا ہوتا ہے، اس پر ذمہ داری بھی اس کے تناسب سے عائد ہوتی ہے؛ اس کو واضح مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جس کے پاس جس قدر زیادہ مال ہوتا ہے، اس پر اسی قدر زیادتی کے ساتھ زکاۃ واجب ہوتی ہے۔ اس لیے امت کے عام افراد کے مقابلے میں علماء کرام کی ذمہ داری زیادہ ہے۔

ہندوستان میں دعوت دین کے وسیع مواقع ہیں، بہ طور خاص ہمارے خطہ گجرات میں تو اس کام کو انتہائی اعلیٰ پیمانے پر انجام دیا جا سکتا ہے اور خاطر خواہ نتائج کی امید کی جا سکتی ہے۔ یہاں مسلمانوں کی ہر بستی سے متصل ایک انتہائی پس ماندہ قوم رہتی ہے، عام طور پر اس کے افراد مسلمانوں کے گھر اور کھیت وغیرہ میں کام کرتے ہیں، ہم ان سے ہر طرح کا کام لیتے ہیں، کیا ہم نے کبھی سوچا کہ اسے دین کی دعوت دیں؟ انہیں ان کے پروردگار سے ملانے کا منصوبہ بنائیں؟ ان میں اللہ کی معرفت پیدا کریں؟ یہ صحیح ہے کہ گجرات کے سیاسی ماحول میں یہ کام بالکل آسان بھی نہیں ہے، خطرات ہیں؛ لیکن اسے جتنا مشکل بلکہ غیر ممکن سمجھ لیا گیا ہے، وہ درست نہیں ہے، کیا مکی دور کے حالات سے زیادہ یہاں کے حالات خراب ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں؛ اس لیے ہمیں ارادہ کرنا ہوگا، پختہ ارادہ، کہ ہم ان کو دین کا پیغام سنا کر رہیں گے، ذات و برادری کے مسائل سے اکتا چکی اس قوم کو، ہم اسلامی اخوت و بھائی چارگی کا پیغام پہنچا کر رہیں گے اور ہم انہیں یہ بتا کر رہیں گے کہ ذات و برادری کی سرحدیں تو انسانوں نے اپنے مفاد کی خاطر کھینچ رکھی ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ روئے زمین پر بسنے والا ہر فرد بشر ایک خدا کا بندہ ہے، ذات پات اور خاندان و برادری صرف شناخت کے لیے ہے، فضیلت کی بنیاد تو صرف اس بات پر ہے کہ کون اللہ کا زیادہ مقرب ہے۔

اگر ہم نے ان پسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والے برادران وطن کو یہ سمجھا دیا کہ ہمارے یہاں ذات پات کی کوئی حقیقت نہیں ہے، ایک ادنیٰ سے ادنیٰ گھرانے سے تعلق

رکھنے والے فرد کو اسلام میں وہی مقام حاصل ہے، جو اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والے کو ہے، یہاں فضیلت کا معیار تقوی ہے، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اسلام کی پر کشش تعلیمات سے متاثر نہ ہوں اور اسلام کی طرف ان کا جھکاؤ نہ رہے، لہذا ہمیں اس محاذ پر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اخیر میں سرپرست مدرسہ شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد قمرالزماں صاحب دامت برکاتہم کی انتہائی مفید کتاب **''دینی اداروں اور جماعتوں کی ذمہ داریاں''** سے ایک اہم مضمون **''مدارس دینیہ کے مؤثر ہونے کے اصول واسباب''** ذکر کرکے اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

مدارس دینیہ کے مؤثر ہونے کے اصول واسباب:

حضرت دامت برکاتہم فرماتے ہیں: دل میں یہ خواہش ہوئی کہ اخیر میں بطور خلاصہ کے یہ حقیر کتاب وسنت، سیرت سلف صالحین اور اپنے علماء وشیوخ کے افاضات وارشادات کی روشنی میں چند اسباب ہدایت اور اصول اصلاح وتربیت لکھے جن پر عمل کرکے ہم ان شاء اللہ اپنے مدارس دینیہ کو مؤثر وکارآمد بنا سکتے ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

(۱) پہلی اصل یہ ہے کہ چونکہ تعلیم وتعلم بھی دین کا ایک اہم عملِ خیر ہے، اس لئے طلبہ وعلماء کو چاہئے کہ اس کی تحصیل میں بھی صحیح نیت اور اخلاص کو اختیار کریں۔ اسی بنا پر حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ ہم طلبہ سے بھی برابر تصحیح نیت اور اخلاص کا مطالبہ فرماتے تھے اور اس کی ضرورت پر شدومد سے کلام فرماتے تھے، چنانچہ ہم لوگوں کو اولاً ان آیات کی تفسیر پڑھائی جن میں نفاق کی مذمت کا بیان ہے تاکہ نفاق سے نفرت پیدا ہوجائے اور اخلاص کی قدروا ہمیت دل نشین ہوجائے۔

(۲) دوسری اصل یہ ہے کہ علماء کرام کو چاہئے کہ اہل دولت وثروت سے کسی قسم کی طمع نہ رکھیں، نہ ان سے سوال کریں اور نہ اپنی ضرورت کا اظہار کریں، اس لئے کہ اس کی وجہ سے ہمارا وعظ و بیان بے اثری کا شکار ہو جائے گا، اسی لئے انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوم کے درمیان اعلان کیا کہ ہم تم سے اس دعوت وتبلیغ پر کسی اجر کا سوال نہیں کرتے اور یہ اس لئے تا کہ مخلوق کے نزدیک طمع کے ساتھ متہم نہ ہو جائیں جو تعلیم وتربیت کی راہ میں سدراہ ہے۔

(۳) تیسری اصل یہ ہے کہ علماء کو چاہئے کہ عوام کو جن باتوں کا حکم کریں ان پر خود بھی عمل کریں اس لئے کہ اس کے خلاف ہونے پر عوام علماء سے ضرور بالضرور بدظن ہوں گے اور ان کی باتوں کو ہرگز ہرگز قبول نہ کریں گے۔

(۴) چوتھی اصل یہ ہے کہ اساتذہ کا فریضہ ہے کہ علوم دین کے طلبہ کو ان کے والدین کی طرف سے امانت سمجھیں، اس لئے کہ تعلیم وتربیت ہی کیلئے دوسرے صوبوں بلکہ دیگر ملکوں کے طلبہ ہمارے مدارس میں آتے ہیں اور اسی غرض سے والدین ان کی جدائی کو گوارا کرتے ہیں کہ ہمارا بچہ دین کا علم وادب سیکھنے گیا ہے؛ لہذا اساتذہ کے لئے لازم ہے کہ حدیث پاک **کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته** کے تحت غایت محبت وشفقت کے ساتھ ان کی تعلیم وتربیت کی فکر رکھیں اور ان کو اخلاق حسنہ سے آراستہ کر کے والدین ہی نہیں بلکہ پوری امت کے حوالہ کریں تا کہ پوری امت کیلئے مفید ثابت ہوں جیسا کہ عصری تعلیم کے جو طلبہ محنت سے پڑھتے ہیں وہی ڈاکٹر وانجینیئر وغیرہ بنکر اپنے لئے نیز والدین کیلئے بلکہ پوری قوم کیلئے مفید ثابت ہوتے ہیں ویسے ہی دینی علوم کے طلبہ کو چاہئے کہ خوب جدوجہد سے علم دین حاصل کر کے اپنے ہی لئے نہیں بلکہ امت محمدیہ کی اصلاح وتربیت کیلئے راہنما و مفید ثابت ہوں۔

(۵) پانچویں اصل یہ ہے کہ تعلیم وتربیت کے باب میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بچوں کے ذہنوں اور دلوں میں توحید ورسالت کے عقیدہ کو مضبوط کریں اور قیامت کا یقین دلوں میں پیوست کریں کہ دنیا ہمیشہ نہ رہے گی ، بلکہ فنا ہوگی ، پس یہ عقائد دین متین کے بنیادی اصول وقواعد ہیں جن پر تمام اعمال کی بنیاد ہے، اگر اس میں کامیابی حاصل ہوگئ تو آگے کی منزلیں ان شاءاللہ بآسانی طے ہوجائیں گی۔

(٦) چھٹی اصل یہ ہے کہ اساتذۂ کرام علم دین کی فضیلت واہمیت کو واضح طور پر سمجھائیں کہ دیکھو کسی علم کی فضیلت اس کی منفعت کے لحاظ سے ہوتی ہے، اگر کسی علم کی منفعت زیادہ اور دائمی ہے تو ظاہر ہے کہ اس علم کی فضیلت بھی زیادہ مانی جاتی ہے؛ لہذا اس اصول سے سمجھو کہ دنیا کے علم کا نفع خواہ کتنا ہی زیادہ ہو وہ دنیا ہی تک محدود رہتا ہے مگر علم دین کا نفع اس دنیا تک ہی نہیں بلکہ اس کا نفع فناء دنیا کے بعد تک جاری رہے گا؛ یہاں تک کہ اللہ تعالی کی رضا وخوشنودی کے حصول اور دخول جنت پر تمام ہوگا جو یقینا سب سے بڑی نعمت ومنفعت ہے۔ نیز طلبۂ کرام کو خاص طور سے ہدایت ہے کہ مزید تقویت وبصیرت کے لئے علماء آخرت کے واقعات اور حالات کی کتابیں پڑھا یا سنا کریں تا کہ علم دین اور عمل صالح کی تحصیل کی طرف رغبت ہو اور آخرت کو سنوارنے کی فکر لاحق ہو۔

(۷) ساتویں اصل یہ ہے کہ اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ کمال ورسوخ علم جوامت پر فرض کفایہ ہے اس کے لئے اہل کا انتخاب کریں تا کہ دینی اہم امور میں اس علم کا استعمال ہو سکے۔ یعنی دین اسلام پر جو ملحدین مشرکین کی طرف سے اعتراضات ہوں ان کا دنداں شکن جواب دیکر ان کے قلوب کو مطمئن کیا جاسکے۔ پس اس کیلئے ضروری ہے کہ اساتذہ اس علم کے لئے نہایت زیرک، عالی ظرف حوصلہ مند طلبہ کا انتخاب کریں تا کہ مقصد حاصل ہو سکے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں فقیہ الامت حضرت سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ارشاد گرامی کو لائحہ عمل بنانے کی اشد ضرورت ہے، وہ یہ ہے:

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: لو ان اھل العلم صانوا العلم ووضعوہ عند اھلہ لسادوا بہ اھل زمانھم ولکنھم بذلوہ لاھل الدنیا لینالوا بہ دنیاھم فھانوا علیھم۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر علماء علم کی حفاظت کرتے اور اس کو اس کے اہل ہی کے سپرد کرتے تو اس کی وجہ سے اہل زمانہ کے سردار ہوجاتے، مگر ان لوگوں نے علم کو اہل دنیا پر صرف کیا تاکہ ان سے مال حاصل کریں جس کی وجہ سے دنیاداروں کے نزدیک ذلیل ورسوا ہوگئے۔ (وصیۃ الآداب: ص/ ۹۴)

(۸) آٹھویں اصل یہ ہے کہ کسی شیخ صالح کی صحبت واقتداء کو لازم سمجھیں، اس لئے کہ جولوگ بھی مراتب عالیہ تک پہونچے ہیں، اسی کے سبب پہونچے ہیں۔ جیسا کہ علامہ شاطبیؒ نے موافقات کی تیسری فصل میں ارقام فرمایا ہے:

والثالثۃ: الاقتداء بمن اخذ عنہ والتأدب بادبہ۔ کما علمت من اقتداء الصحابۃ بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم واقتداء التابعین بالصحابۃ وھکذا فی کل قرن۔

وبھذا الوصف امتاز مالک عن اضرابہ۔ اعنی بشدۃ الاتصاف بہ والا فالجمیع ممن یھتدی بہ فی الدین کذلک کانوا ولکن مالکا اشتھر بالمبالغۃ فی ھذا المعنی۔ فلما ترک ھذا الوصف رفعت البدع رؤوسھا لان ترک الاقتداء دلیل علی امر حدث عنہ التارک، اصلہ اتباع الھویٰ۔ (الموافقات: ج: ۱، ص: ۹۳)

اور تیسرے جس کی صحبت میں رہ کر اس نے علم حاصل کیا اس کی اقتداء کرنا اور اس کے ادب سے ادب سیکھنا بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ تم نے جانا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء کی اور اسی طرح تابعین نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اقتداء کی اور اسی طرح ہر زمانے میں چھوٹے اپنے بڑوں کی اقتداء کرتے رہے۔ (جس کی وجہ سے فائز المرام ہوئے۔)

اور امام مالکؒ اسی صفت کی وجہ سے اپنے ہمعصروں سے ممتاز ہو گئے، انہوں نے اقتداء میں خاص امتیازی شان حاصل کی ورنہ اس زمانے کے علماء جن کی اقتداء کی جاتی ہے سب نے ان اوصاف کو اختیار کیا تھا مگر ان میں امام مالکؒ اسی وجہ سے زیادہ مشہور ہو گئے کہ انہوں نے مبالغہ کے ساتھ ان اوصاف کو اختیار کیا تھا، پس جب ان اوصاف کو ترک کیا جاوے گا تو بدعت سر اٹھائے گی، اس وجہ سے کہ اقتداء کو ترک کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ تارک پر ایسی کوئی بات پیش آئی ہے جس کی وجہ سے اتباع کو اختیار کر لیا ہے۔

(۹) نویں اصل یہ ہیکہ ہمارے معلمین واساتذہ کو طلبہ کی ایسی تعلیم وتربیت کرنی چاہئے کہ زمانہ طالب علمی ہی میں ان کا قلب اللہ کی محبت ومعرفت سے معمور اور خلق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعمت سے سرشار ہو جائے نیز ان کا ذہن ودماغ ذاتی پستی وسطحیت سے نکل کر علم ومعرفت کی بلندی اور لفظ سے ترقی کر کے منزل معنی تک پہونچ جائے۔ اللہ تعالی ہم سب کو ایسی تعلیم وتربیت کی صلاحیت وتوفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

(۱۰) دسویں اصل خاص طور سے طلبہ کے لئے ہے کہ آپ کے مدرسین و اساتذہ کیسے ہی اہل وباصلاحیت اور خون پسینہ ایک کرنے والے ہوں، تاہم اس کے ساتھ

آپ کے اندر بھی طلب وعزم اور جد وجہد کا ہونا بھی ناگزیر ہے، اساتذہ کا ادب واحترام لازم ہے تاکہ وہ دل سے آپ کی تعلیمی وتربیتی ترقی کی طرف متوجہ ہوں اور آپ کو اپنے مفید تجربہ اور آداب کی طرف رہنمائی کریں، جس پر چل کر آپ درجۂ کمال تک پہونچیں۔

طلبہ کو ہرگز ہرگز اپنے بڑوں سے کمال حاصل کرنے میں کبر وعار نہ کرنا چاہئے؛ جیسا کہ مرشدی حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہؒ صاحب نے فرمایا کہ اتنے دنوں کے بعد اس بڑھاپے میں جب کہ کسی چیز کی تحصیل کا وقت باقی نہیں رہا یہ بات سمجھ میں آئی کہ انسان کو کسی کمال کی تحصیل سے جو چیز مانع ہوتی ہے وہ اس کا کبر وعار ہے کیونکہ یہی چیز اس کو کسی کامل کے آگے جھکنے سے منع کرتی ہے، ورنہ ہر ہی زمانہ میں اہل کمال رہتے ہیں جن سے کمال حاصل کیا جاسکتا ہے، مگر اسی عار واستکبار کی بنا پر ان کے سامنے جھکتے نہیں اس لئے کچھ حاصل بھی نہیں ہوتا، کورے کے کورے ہی رہ جاتے ہیں، آدمی جب اپنی خودی وتکبر کو چھوڑتا ہے تب کچھ حاصل ہوتا ہے ع ہر کجا پستی است آب آنجا رود۔

میں حضراتِ اہل علم کو خصوصاً اس جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ آج علماء اور طلبہ کو کوئی کمال جو حاصل نہیں ہو رہا ہے اس کی وجہ یہی ان کا عار اور تکبر ہے، یہی ان کی راہ مارے رہتا ہے، اس کو اگر سمجھ لیں اور ہمت کر کے اس کو ترک کر دیں تو کمال کے درجہ کو پہنچ سکتے ہیں، چنانچہ جن لوگوں کو کمال حاصل ہوا ہے وہ اپنے کو مٹانے اور کسی کے آگے خود کو گرانے اور اپنے کبر وعار کو ختم کرنے ہی سے حاصل ہوا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔ وصی اللہ عفی عنہ۔

اخیر میں، میں دوبارہ آپ حضرات کا بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے سفر کی زحمت اٹھائی

اور یہاں تشریف لائے، نیز رب کریم کے حضور دعاء گو ہوں کہ وہ ہماری ان خدمات کو قبول فرماتے ہوئے دارین میں بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

آمین بحرمۃ سید المرسلین ﷺ

(مولانا) محمد اقبال بن محمد ٹنکاروی (صاحب)

مہتمم دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا بھروچ